

# اسلام کا نظامِ تعلیم

محمد یوسف گوریہ

\*

ایمان و علم کا رشتہ | ادیانِ عالم میں صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے علم کو ایمان کے لئے ضروری قرار دیا ہے، سب سے پہلی وحی میں ارشادِ ربّانی ہے: اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ "اقْرَأْ و رَبِّكَ الْاَكْرَمَ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" پڑھئے اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، اور پڑھئے بجا لیکہ آپ کا ربِ کریم وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم عطا کیا۔ علم کی اہمیت کے پیش نظر اللہ نے خاص طور پر اس بات کا ذکر فرمایا کہ اے خود اللہ ہی نے انسان کو سکھایا ہے: "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَم"۔ پھر یہ بھی کہ انسان پر یہ اللہ ہی کا احسان ہے کہ اس نے یہ سکھایا کہ وہ علوم و فنون کی حفاظت اور ابلاغِ عام کے لئے انہیں تحریک میں لائے۔ قرآن کی اس سب سے پہلی وحی میں علم کے حصول اور پڑھنے کی تاکید دونوں کا بیان نہایت معنی خیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفاتِ ربوبیت اور خالقیت کے ذکر سے پہلے انسان کی تعلیم کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ تعلیم اور حصولِ تعلیم کی اہمیت بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔

ایمان کے لئے علم کی ضرورت کا قرآنی تصور تاریخِ عالم میں ایک زبردست انقلاب تھا۔ پورا قرآن المسد سے و الناس تک علم، ایمان اور ان کے مطابق عمل کرنے اور دونوں جہان میں فلاح و کامیابی حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے جس طرح عبادات کی تفصیلات جاننا ضروری ہے۔ اسی طرح معاملات کی جزئیات سے واقفیت نہایت اہم ہے۔ اسلامی عبادات کا تصور بذاتِ خود ایک انقلابی تصور ہے۔ ہر عبادت کسی نہ کسی طرح انسانی و معاشرتی تعلقات کی آئینہ دار ہے لیکن معاملات کا دائرہ تو اتنا وسیع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ، اسلام کی اصولی تعلیمات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ عبادات و معاملات کی اس گہری ہم آہنگی کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ہر مسلمان پر فرض ماند ہوا کہ وہ ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی تفصیلات جاننے کے ساتھ حلال و حرام، نکاح و طلاق، صلح و جنگ، اطاعت و عصیان، معاشرتی و عائلی قوانین کے بارے میں تعلیم حاصل کرے، باصلاحیت اور باشعور

افراد پر مبنی معاشرے کی تشکیل کے ساتھ قرآن نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ اسلام روئے عالم کے ادیان پر غالب آئے گا اس لیے ضروری تھا کہ معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب اور تمدن کے اعلیٰ اصولوں کی تعلیم کے ساتھ ان علوم کی طرف رہنمائی بھی کرتا جو طبیعیات سے متعلق تھے یہی وجہ ہے کہ انفس و آفاق پر غور و تدبیر کا حکم دیا۔ ارض و سموات اور ان کے درمیان کی موجودات کو سمجھنے، نباتات و جمادات پر غور کر کے نتائج اخذ کرنے اور اجرام فلکی پر غور و فکر کر کے انہیں مسخر کرنے کی تاکید کی۔ علوم کے اس تنوع میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب ایک طرف سابق انبیاء جن کی تعلیمات کا ماخذ حکم خداوندی تھا اور دوسری طرف حکماء جن کی تعلیمات کی بنیاد علت و معلول کی تحقیق اور عقلی دقیقہ سنجی تھی۔ نبی آخر الزمان کی تعلیمات درحقیقت قرآن حکیم کی تعلیمات کی تشریح و توضیح ہیں جن کے امتزاج کو ایک انتہائی بلیغ اصطلاح کتاب وحمت نے بیان کیا گیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اگر قرآنی حکمت نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ، باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا تو کتاب نے حکمت کو محض سخن طرازی اور نکتہ پروری پر ہی ختم نہیں ہونے دیا بلکہ پیغمبر اسلام کے مثالی کردار اور مقدس کارناموں کے ذریعے خیر و برکت کی سلسیل کا فیضان بھی جاری کر دیا۔

اب ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ قرآنی نقطہ نظر سے اہل علم کے ایمان کا بڑا درجہ ہے۔ نا سمجھ اور اپنی ضد پر اصرار کرنے والے کے ایمان کو قرآن نا بچھتا اور ضعیف قرار دیتا ہے۔

قرآن پاک نے ایمان کے ساتھ عمل پر بڑا زور دیا ہے، چنانچہ صرف دلی عقیدے کا اعتبار اسلام میں نہیں۔ ایمان و عقیدے کے مطابق عمل کا اظہار ضروری ہے اور ایمان کے مطابق عملی مظاہرہ کو قرآن نے اسلام سے تعبیر کیا ہے (تالت الاعراب امانا قل لعدو منوا ولكن قولوا اسلمنا ولما يدخل الایمان فی قلوبکم (۱۱۴:۴۹)۔ جہالت، ضد اور گنواہی کی قرآن نے شدید ترین الفاظ میں مذمت کی ہے، اور بتایا ہے کہ نا سمجھ گنواہ اپنے عقیدے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہ بتایا کہ احکام الہی کے اسرار و رموز کو ایک نا سمجھ اجڈ اپنی ضد کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتا۔ الاعراب اشد کفراً وفاقا و اجدراً الایملواحد و ما انزل اللہ علی رسولہ (۹:۹)۔

ایمان کے لئے علم کو ضروری قرار دینے کے سلسلے میں سورۃ عنکبوت بڑی شہادت فراہم کرتی ہے، اس کی سب سے پہلی آیت میں اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ محض زبان سے ایمان کا اقرار کر لینے سے انسان چھوڑ دیے جائیں گے۔ پھر اس سورۃ کی بیالیس آیتیں عقائد و اخلاق، اعمال و افعال، اقوام و ملل کے عروج و زوال پر تبصرہ کرتی ہیں اور سابق انبیاء کے واقعات و حالات بیان کر کے فرمایا کہ: یہ تاریخی حقائق پر مبنی مثالیں ہیں

ہم انہیں لوگوں کے سمجھانے بھانے کے لئے بیان کرتے ہیں اور ان مثالوں کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جو عالم ہوں۔ اس سورۃ نے انتہائی وضاحت کے ساتھ اس بات کا ثبوت فراہم کیا کہ علم و عمل کے بغیر ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور ایمان اسی شخص کو فائدہ پہنچا سکتا ہے جو علم کی روشنی سے مستفید ہو۔ ”وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ“ اسی سورۃ کی آیت نمبر ۴۹۔ اس مضمون کی یوں وضاحت کرتی ہے: اہل علم لوگوں کے لئے یہ کتاب (قرآن) تو انتہائی بین دلائل ہیں اور ہمارے ان واضح دلائل کا انکار سوائے ظالم (جاہل) لوگوں کے اور کوئی ٹھہری نہیں سکتا۔ اس آیت میں اہل علم اور ظالم و جاہل کو ایک ساتھ بیان کر کے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ قرآن پر انہیں لوگوں کا ایمان صدق پر مبنی قرار دیا جائے گا۔ جنہوں نے اپنے ایمان کو علم سے مضبوط کیا ہو، جاہل اور ظالم زبانی اقرار کے باوجود، قرآن کے بین دلائل سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کر سکیں گے، بلکہ الٹا ان واضح دلائل کا انکار کر دیں گے۔ سورہ فاطر نمبر ۳۵ کی دس آیات ۱۹ تا ۲۸ علم و ایمان کے لزوم کو قطعی دلائل سے بیان کرتی ہیں اور جہالت کو ایمان کی ضد قرار دیتی ہیں، ان آیات میں جاہل اور علم کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

”انھا اور بیتا برابر نہیں ہو سکتے اور نہ تاریخی اور نہ روشنی اور نہ چھاؤں اور نہ دھوپ،

اور نہ ہی زندہ اور مردہ برابر ہو سکتے ہیں“

پھر ارض و سما و جبال و ثمرات اور ان کے الوان و اقسام کا تذکرہ کر کے، انسانوں، جانوروں اور چوپایوں اور ان کے انواع و اقسام کا ذکر کیا ہے اور آخر میں فرمایا: خدا سے اس کے صرف وہی بندے ڈرتے ہیں جو اہل علم ہوں، اس آیت میں ایک طرف ارض و سما کی ہر قسم کی مخلوق کا بیان ہے۔ دوسری طرف اس مخلوق میں سے اہل علم انسانوں کا تذکرہ ہے اور تیسری طرف خشیت الہی کا اظہار ہے۔ قرآن میں خشیت الہی، اللہ پر ایمان کا بنیادی عنصر ہے اور اس آیت کی رو سے ارض و سما کی تمام مخلوقات میں سے اللہ کی خشیت صرف ان انسانوں کو نصیب ہوگی جو علم و فضل کی دولت سے مالا مال ہوں گے اور جو لوگ علم سے کورے ہوں گے، ان کا شمار شکل و صورت کے اعتبار سے خواہ انسانوں میں ہو یا حیوانوں میں، جمادات میں ہو یا نباتات میں خشیت الہی سے محروم رہیں گے۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (۲۸: ۳۵) سورۃ زمر نمبر ۳۹، میں مختلف مضامین بیان کر کے پوچھا: ”قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۱۹: ۳۹)“ دیکھئے، کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں؟ گویا ایمان و عقائد کا معاملہ ہو یا معاشرت و معیشت کا

براعتبار سے انہیں لوگوں کو اہمیت حاصل ہوگی جو اہل علم ہوں گے اور جہلا کا نہ ایمان معتبر ہوگا، نہ ہی کسی دوسرے کام میں انہیں کوئی اہمیت دی جائے گی۔ ایمان و علم کا لزوم جو صحیح اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے، اس لئے جہاں علم کو ایمان کا جزو لاینفک قرار دیا وہاں جہل کو ایمان کی ضد ٹھہرایا۔ اور پھر اس عقیدے کی تکرار و وضاحت کی۔ چنانچہ فرمایا: **يرفع الله الذين آمنوا منكم والذين اوتوا العلم درجات (۵۸: ۱۱)** اللہ ان لوگوں کے درجات کو بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا، اس آیت میں ایمان علم کو ایک ساتھ بیان کر کے ان کے لزوم کو فرض میں قرار دیا ہے اور اس ایمان کو درجات کی بلندی کا سبب بتایا ہے۔ جو علم سے مضبوط کیا گیا ہو، اسلامی نقطہ نگاہ سے اہل علم کے ایمان کا بڑا مرتبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آیت میں ایسے اہل علم ایمانداروں کا مرتبہ اتنا بلند بتایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کے اثبات پر شہادت دی تو اس شہادت میں پوری کائنات میں سے جو تین گواہ پیش ہوئے ان میں سے ایک خود اللہ، دوسرے فرشتے اور تیسرے اہل علم تھے: **شهد الله انه لا اله الا هو والملائكة واولوا العلم (۱۸: ۳)**۔ ایمان و علم کے التزام کا یہ اہتمام اور پھر اس التزام کی یہ قدر دانی تاریخ ادیان عالم میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس آیت میں ترتیب بیان کے اعتبار سے فرشتوں کا بیان اگرچہ اہل علم سے پہلے کیا گیا ہے لیکن ایک دوسری جگہ اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ انسان جب ایمان و علم کے زیور سے آراستہ ہوتا ہے۔ تو اس کا درجہ فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس کا ثبوت حضرت آدمؑ کے قصے میں بالوضاحت موجود ہے۔ حضرت آدمؑ کا ایمان جب علم سے مزین ہو گیا **وعلم آدم الاسماء كلها (۲: ۳۱)** تو فرشتے جو محض ایمان رکھتے تھے، ایمان و علم کے پیکر کے آگے سجدہ ریز ہو گئے اور ملائکہ اقرار کر لیا: **سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا** اے اللہ تو پاک ہے ہمیں قطعاً علم نہیں ہے۔

اسلام میں ایمان و علم کے لزوم کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے سابق انبیاء کی تعلیمات کی تصدیق اور ان میں تلبیس حق و باطل کی تحقیق کی ذمہ داری بھی اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ **نَزَّلَ عَلَيْنَا الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (۲: ۳)** اور اس اتنی بڑی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتا، کسی مسلمان کے لئے ممکن نہیں جب تک وہ تمام علوم و فنون سے پوری طرح واقف نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزماں کو وہ دین ذکیر بھیجا جسے ادیان عالم پر غالب آنا ہے: **هُوَ الَّذِي اَرْسَلَ رَسُولًا بِالْهُدٰى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلَى الْاٰدِيٰنِ حَقَّ دِيْنِهِ (۹: ۱۱)** ظاہر ہے کہ دین اسلام کے بقیہ ادیان پر غالب آنے کا یہی مطلب ہے کہ اس دین کے ماننے والے ان تمام علوم سے پوری طرح آگاہ ہوں جو تقابل ادیان کے لئے ضروری ہیں، احقاق حق، اور

قوتِ استدلال سے پوری طرح مسلح ہوں۔ ہر دور کے علوم و فنون اور منطق و فلسفہ سے پوری طرح آراستہ ہوں، اور ان ادیان کے ماننے والوں نے جن جن علوم میں اپنی بالادستی قائم کر رکھی ہو ان پر نہ صرف پورا پورا عبور ہو، بلکہ دینِ اسلام کو ان پر غالب کرنے کے لئے ضروری ہے، کہ مسلمان ان کی قیادت کی حیثیت رکھتے ہوں۔ دینِ اسلام کا یہ غلبہ صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ مسلمان انفرادی و اجتماعی حیثیت سے دین و دنیا کے علوم کے قائد ہوں۔ اسلام کا یہ بھی دعویٰ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانیت کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ ”قل یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً“ اس دعوے کی صداقت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام مسلمان پوری انسانیت کی رہنمائی کی قیادت کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اور عالم انسانیت کی رہنمائی کی صلاحیت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی، جب تک کہ ہر قسم کے علوم کے حصول کے بعد مسلمان پوری انسانیت کے قائد نہ بن جائیں۔ ایک آیت میں فرمایا کہ مسلمانوں کو عالم انسانیت میں وہ کردار ادا کرنا ہوتا ہے جو رسول مسلمانوں میں ادا کرتا ہے۔ ”لتکونوا شهداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شہیداً“ (۲: ۱۴۳) ایک اور آیت میں فرمایا کہ تم ”حییرامۃ“ ہو، تمہارا فرض منصبی یہ ہے کہ تم بہتر سے بہتر حالت کی طرف مسلسل رہنمائی کرتے رہو، انسانی فلاح و بہبود کے اصولوں کو اپنانا، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے اس حیثیت میں ہو کہ تم پوری انسانیت کو بھلائی کا حکم دے سکو اور ان مضر کاموں سے انسانیت کو روک سکو جن میں اس کی ہلاکت ہو، ”کنتم حیرامۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر“ اب یہ بات اتنی بین اور واضح ہے کہ ”شہداء علی الناس“ اور ”حییرامۃ“ جیسے عظیم رتبوں پر فائز ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مسلمان انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے، پوری انسانیت میں ایمان و علم کے اس مقام پر فائز نہ ہوں، جس مقام پر اصحاب رسول مسلمانوں میں فائز تھے۔ جب تک مسلمان عالم انسانیت میں اپنے اس مقام کو حاصل نہیں کر لیتے، قرآنی تعلیمات کی رو سے ان کا ایمان غیر معتبر ہے اور صاف ظاہر ہے کہ ایمان کے بعد مسلمان کو اس مقام پر اگر کوئی طاقت پہنچا سکتی ہے تو وہ صرف علم میں زبردست ترقی اور ان پر اس حد تک دسترس ہے کہ وہ اقوام عالم کی قیادت خود سنبھال سکیں۔

اس بات کے ثابت ہو جانے کے بعد کہ اسلام میں ایمان کی تکمیل کی لازمی شرط علم ہے اور یہ کہ علم کے بغیر ایمان غیر معتبر ہے، اب ہم مختصر طور پر تعلیمی اقدامات اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ ایمان و علم کو لازم و ملزوم قرار دینے والے رسول نے علم کی ترویج کے لئے عملاً

کیا کیا اقدامات اٹھائے: ”بلغ ما انزل الیہ“ کی ہدایت کے تحت آپ نے جہاں تبلیغ کا فریضہ انجام دیا، وہاں تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام فرمایا۔ قرآن نے رسول اکرم کے تعلیم دینے پر شہادت دی ہے یتلوا علیہم آیتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمتا (جمعہ: ۱۱) اس آیت میں تین فرائض کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ۱۔ بین دلائل کو تلاوت کے ذریعہ پیش کرنا۔ ۲۔ مسلمانوں کو تربیت دینا۔ ۳۔ اور کتاب و حکمت کی تعلیم دینا۔ ابن ماجہ باب فضل العلماء کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا ”بعثتُ معلماً“ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے اس فریضہ کو باحسن طریق انجام دیا۔

**دارِ ارقم** سب سے پہلی اسلامی تعلیم گاہ فرماتے لیکن باقاعدہ تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے سب سے پہلے جس درگاہ کا پتہ چلتا ہے وہ ”دارِ ارقم“ تھا۔ جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے، وہ اس سب سے پہلی یونیورسٹی کے باقاعدہ طالب علم شمار ہوتے، ایک خاص پروگرام کے تحت آپ اپنے صحابہ کی تربیت کرتے اور باقاعدہ درس و تدریس کا اہتمام فرماتے۔ قرآن کی تعلیمات کی تبلیغ اور تعلیم کے فرائض کو خود حضور کے ذمے تھے لیکن آیاتِ قرآنی کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے آپ نے ایک الگ شعبہ کتابت قائم کر رکھا تھا، ہجری کتابت العلم کی روایت کے مطابق اس پر سب سے پہلے عبداللہ بن سعید بن عاص مقرر ہوئے حضرت عبداللہ بن سعید شعبہ کتابت کے نگران ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کو کتابت بھی سکھاتے تھے۔ جب مدینے کے چند لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ تو آپ نے قرآنی تعلیمات کی تبلیغ و تعلیم کا ایک مرکز وہاں قائم کیا اور حضرت جعہ بن عفرہ کو بحیثیت اسحاق و ان مقرر کیا۔

مملکت اسلامیہ کی سب سے بڑی دانش گاہ ”مسجد نبوی“ ہجرت مدینہ کے بعد آپ نے وہاں پہنچے ہی سب سے پہلے دنیا کی عظیم ترین یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جو مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس درس گاہ اعظم میں انسانی ترقی کی ہر قوت و صلاحیت نشوونما پا رہی تھی، سرور کائنات کی ذات اس عمومی جامعہ کی مرکز و محور تھی، ہر قسم اور ہر مذاق کے طالب علم آتے تھے۔ اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی استعداد کے مطابق تحصیل علم کرتے تھے۔ اس یونیورسٹی میں صحابہ اپنے ذوق اور طبیعت کے مطابق مختلف علوم میں دلچسپی کے اعتبار سے مختلف شعبوں میں بٹ گئے تھے۔ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی جلد ششم میں اس درس گاہ کا نقشہ یوں کھینچا ہے: ”کہیں ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ جیسے فرمانروا زیر تعلیم ہیں، کہیں طلحہؓ و زبیرؓ و معاویہؓ و سعد بن معاذؓ و سعد بن جبیرؓ جیسے اربابِ رائے و تدبیر ہیں، کہیں خالدؓ ابو عبیدہؓ و سعد

بن ابی وقاص اور عمرو بن العاص جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صمدیوں کے حکمران عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقتن بنے، کہیں ان زہاد و عباد کا مجمع ہے، جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹی ہیں، کہیں ابو ذرؓ و سلمانؓ و ابوذر داءؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو مسیح اسلام کہلاتے تھے، کہیں وہ صفحہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لاکر بیچتے اور گزارہ کرتے، اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ جیسے فقیہ و محدث تھے جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا۔

اس درس گاہ کے مختلف شعبوں میں ایک شعبہ ایسا بھی تھا، جس میں اساتذہ کو تربیت دی جاتی تھی۔ یہ رہائشی شعبہ تھا جس میں تربیت حاصل کرنے

### اقامتی تربیت گاہ

والے تمام طالب علم شب و روز وہیں قیام کرتے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا مسجد نبوی کے ساتھ ہی ملحق تھا۔ اسے ”صفحہ“ کہا جاتا تھا اور جو لوگ اس میں تربیت پاتے تھے انہیں ”اصحاب الصفحہ“ کا نام دیا جاتا تھا۔ آپ یہاں اصحاب الصفحہ کو بنفس نفیس قرآن کی تعلیم دیتے، بخاری کی روایت کے مطابق آپ نے اپنے ساتھ چار معلم اور ایک خوشنویس مقرر فرمایا تھا، آپ فرماتے تھے ”چار آدمیوں سے قرآن پڑھو، عبداللہ بن مسعود، سالم الخولی، حذیفہ، ابی ابن کعب اور معاذ بن جبل“

خواتین کی تعلیم و تربیت کو بھی آپ نے اتنی ہی اہمیت دی جتنی مردوں کو دی

### تعلیم نسوان

تھی، آپ کے پہلے خطبوں اور جلسوں میں مسلمان خواتین شریک ہوئیں، غزوہ بدر کے مواقع پر وہ آپ سے استفادہ کرتیں، لیکن یہ سب خواتین کے مخصوص حالات کے پیش نظر کافی نہ تھا۔ چنانچہ آپ نے اس کے لئے خاص اہتمام فرمایا اور خواتین کی تعلیم و تربیت کے لئے ام المومنین حضرت عائشہؓ کی سرکردگی میں تعلیم نسوان کا الگ پروگرام بنایا۔ تعلیم نسوان کا مرکز خود حضرت عائشہؓ کا اپنا گھر تھا۔ اور باقی امہات المومنین کے حجرے اور دوسری پڑھی لکھی مسلمان خواتین کے گھر اس کے ملحقہ ڈیپارٹمنٹ تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کی رہنمائی میں تعلیم نسوان کے پروگرام کو انتہائی کامیابی کے ساتھ چلایا، مدینے کی خواتین اور باہر سے آنے والی خواتین کی تعلیم و تربیت کے فریضے کو آپ نے بڑی ہی حسن و

خوبی سے نبایا۔ سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان کے ساتھ علم سکھانے کی ضرورت کا اتنا احساس

تھا کہ آپ صحابہ کرام کی تعلیم و تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ غزوہ بدر کے قیدیوں میں جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان کو رہا کرنے کا فیصلہ آپ نے یہ مقرر فرمایا کہ ہر قیدی دس مسلمان بچوں کو

## صوبوں کے معاینے کا تقرر

حضور کی ان کوششوں کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ قلیل عرصہ میں علم و فضل کی دولت سے مالا مال ہو گئے اور آپؐ کو تربیت یافتہ ماہرین فن اساتذہ

کو مختلف مقامات پر بھیجے میں کبھی کی موسس نہ ہوئی۔ لیکن میں حضرت معاذ بن جبل کی تقرری ہوئی۔ سحران میں عمرو بن حزم کو معلم بنا کر بھیجا گیا۔ اسی طرح جب قبائل قارہ و عضل مشرف بہ اسلام ہوئے تو آپؐ نے ان کی تعلیم کے لئے چھ مدرس مقرر کئے: مرشد بن ابی مرشد، عامر بن ثابت، حذیب بن عدی، خالد بن البکیر، زید بن وثنہ، عبداللہ بن طارق۔ قرآن کے ایمان و علم کے لزوم پر اصرار کا یہ اثر ہوا کہ جو قبیلہ بھی اسلام قبول کرتا فوراً علم سیکھنے کے لئے مدینہ آتا یا چند نمایندہ افراد کو مدینے بھیجا جاتا تاکہ وہ وہاں سے علم سیکھ کر اپنے قبیلے کو تعلیم دیں۔ سیر و احادیث کی کتابیں ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہیں۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے علم کو یہ بلند مرتبہ دے کر اسے ایمان کا جزو لاینفک قرار دے دیا۔ اور پھر اس کتاب

جہالت کی روک تھام  
اسلامی حکومت کا فریضہ ہے

و حکمت کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ان تمام وسائل سے کام لیا گیا، جو انسانی حد تک ممکن تھے۔ یہ اس لئے ضروری قرار دیا گیا کہ کہیں دین اسلام کا بھی سابقہ ادیان کی طرح زبانی اقرار اور چند عادات کی ادائیگی تک محدود نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے فروغ و ترقی اور اس کی نشر و اشاعت کو مصارف زکوٰۃ میں داخل کیا گیا، اور حکومت پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ وہ جہالت کے مکمل خاتمہ تک اس فریضے کی ادائیگی سے عہدہ برائے نہیں ہو سکتی، اگر دنیا میں کوئی اسلامی حکومت قائم ہو، اور اس ملک میں جہالت باقی رہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا، کہ ایسی حکومت جان بوجھ کر مسلمانوں کو کافر بنانے پر تلی ہوئی ہے اور قصداً اس بات کا ہتھیار کئے ہوئے ہے کہ مسلمان ایمان کی تکمیل سے قاصر رہیں۔ اور اس طرح عملاً اسلام کے منکر بنیں۔ ایسی حکومت قرآن کے نقطہ نظر سے اسلامی حکومت نہیں کہلا سکتی، کیونکہ اسلامی حکومت کا تو فرض اولین یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی اور ان کی ترقی و عروج کے لئے اپنے تمام وسائل بروئے کار لائے، تاکہ مسلمان ایمان کے ساتھ علم کی دوسری شرط پوری کر کے صحیح اور سچے مسلمان بن سکیں۔

زکوٰۃ کا ایک مصرف | مصارف زکوٰۃ میں سے ایک مصرف تعلیم قرآن دین میں تفقہ پیدا کرنا اور تعلیم و تربیت بھی ہے | قارئین کو بھیجنا تھا، حضرات معاذ بن جبل، ابو موسیٰ الاشعری، عمرو بن حزم وغیرہم کو جب یمن، سحران اور دوسرے اضلاع میں تعلیم دین پر متعین کیا گیا تو یہ حضرات اپنے اپنے علاقوں میں تعلیمی انرجات زکوٰۃ ہی سے پورے کرتے تھے، ابن جوزی نے سیرۃ العزیزین میں بیان کیا ہے، کہ حضرت



عرض نے معاین کے لئے باقاعدہ ماہوار تنخواہ مقرر کر رکھی تھی۔ مصارفِ زکوٰۃ میں ”فی سبیلہ اللہ“ ایک ایسا مصرف ہے، جو تعلیم جیسے اہم فریضے کی ادائیگی پر خرچ کیا جاتا تھا، ایک طرف علم کو ایمان کے ساتھ لازم قرار دیا اور دوسری طرف علم کی نشر و اشاعت کرنے کے لئے اسے حکومت کے بنیادی فرائض میں رکھ کر اس کی عظمت و اہمیت کو اتہا تک پہنچا دیا۔ وجہ یہ ہے کہ علم اور ادراک ہی روشن دماغوں کی بنیاد ہیں، جن کی بنا پر ایک سائنسدان و حکیم کو خشرات الارض پر ترجیح دی جاتی ہے۔ انسان کی برتری کا مدار اس کے ذہنی شعور پر ہے۔ علم، جذبات اور قوت کے حلقہ کو تباہ و برباد کر دینا، انسانی شخصیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ قوتِ ارادی اور قوت کے بروئے کار لانے ہی سے فرد جماعت کا موثر رکن بن سکتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ صرف ایک غیر معمولی عظمت کے مالک انسان ہی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ انفرادی فکر سے کوئی ایسا نصب العین وضع کرے، جس کے ساتھ تعاون کرنے میں لوگوں کو بہتری نظر آئے، اور جب ایسا نصب العین تیار ہو جائے تو وہ دوسروں کو پیروی پر آمادہ بھی کر سکے، علم و ادراک کے بغیر ایک شخص برسرِ اقتدار طاقت سے خواہ وہ شخصی ہو یا جمہوری آمادہٴ مصالحت رہتا ہے، یہ صفتِ عظیم المرتبت انسانوں کے امتیازی اوصاف کی ضد ہے۔ اسلام ایسے افراد چاہتا ہے جن میں اتنی پروازِ فکر ہو کہ وہ موجودہ نظام سے بہتر اور مختلف نظام کا تصور قائم کر سکیں، حال کو اقدار کے نقطہ نظر سے جانچ سکیں، اس لئے کہ تقلید پسندی کی تمام صورتیں فہم و فراست کی موت کے مترادف ہیں۔ اسلام کا مقصد اجتماعی اہمیت کے لئے انفرادیت کا عروج و ارتقا ہے۔ اور اس عروج و ارتقا کو درجہ کمال پر پہنچانے کے لئے علمِ نفسیات، علمِ فطرت، علمِ ابدان، علمِ حیوانات، سائنسی انکشافات، جدید نفسیاتی تجربات اور شاہدات کا گہرا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ اور سہولت کا بندوبست کرنا حکومت کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ ”فدویضۃ من اللہ“

تعلیم کا مقصد اولین یہ ہے کہ وہ انسان کی تمام خداداد صلاحیتوں کی تربیت کرے۔

**مقصدِ تعلیم** ظاہری جوارح و اعضاء سے لے کر اندرونی اعضاءِ ریسہ کی تربیت اور ان کے نشو و ارتقا، کافر فیضہٴ تعلیم کے ذمے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ بات حکومتِ اسلامیہ کے فرائض منصبی میں داخل ہے (فدویضۃ من اللہ) کہ وہ ملک کے ہر فرد کی ظاہری و باطنی صلاحیتوں کی تربیت کا بہتر سے بہتر اہتمام کرے اور ہر فرد کو اس قابل بنائے کہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک و ملت کی خدمات انجام دے، جو حکومت اپنی مملکت کے افراد کی صلاحیتوں کی تربیت نہیں کرتی، وہ دراصل پوری قوم کو اپنا بچ بنانے کے جرم کا ارتکاب کرتی ہے۔

## تعلیم و دفاع

مسلمانوں کو کفر کے مقابلے میں ہر طرح سے تیار رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْمُحْتَاحِ تَرَاهُمْ بِمَعَدَّةِ اللَّهِ

مَدُّوْكُمْ وَأَخِيبِيْنَ مِنْ دُونِهِمْ۔ لَّا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۗ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ (۸: ۱۶) اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری قوت کے ساتھ تیاری کرو۔ افرادی قوت کو بڑھا کر اور اسلحہ سازی کی فیکٹریاں قائم کر کے، افرادی قوت اور اسلحہ سازی کی زبردست تیاری سے اللہ کے دشمنوں اور خود اپنے ان دشمنوں کو ڈراؤ (جن کے ساتھ تمہارا براہ راست تصادم ہے) اور ان کے علاوہ ان دشمنوں کو بھی جنہیں اگر چہ تم نہیں جانتے لیکن اللہ انہیں ضرور جانتا ہے۔

اس آیت میں اللہ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے دشمنوں کے خلاف زبردست تیاری کا حکم دیا گیا ہے۔ اور وہ تیاری بھی ایسی جس میں مسلمانوں کی پوری قوت شامل حال ہو، اور جس میں اس وقت کی ہر طاقت استعمال میں لائی گئی ہو، آیت میں انتہائی جامع اور معجز بیانی سے ”من قوۃ ومن رباط الخیل“ کا استعمال ہوا ہے۔ ”من قوۃ“ ہر قسم کی قوت کے لئے عام ہے جس میں افرادی قوت نمایاں ہے اور رباط الخیل سے سرمدوں کا دفاع مراد ہے جو اس زمانے کی جدید ترین اسلحہ سازی فیکٹریوں سے ممکن ہے۔ افرادی قوت کی تیاری میں، دورِ جدید میں، فنی اہمیت تعلیم کو حاصل ہے، کوئی دوسرا عنصر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ افرادی قوت کی تیاری میں ماضی، حال اور مستقبل میں تعلیم کا کردار باقی تمام عناصر کی نسبت سب سے زیادہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا، ماضی اور ماضی بعید میں تعلیم سے اس نظریہ حیات کو مجاہد گئے قلب و دماغ میں بٹھانا مقصود ہوتا تھا، جس کی خاطر وہ میدانِ جنگ میں اپنا ستر تھیلی پر رکھ کر نکلتا تھا، اس نظریہ حیات سے سرشاری اسے تلوار کی آبی پر رقصاں کرتی تھی۔ اور اس نظریہ حیات سے مست ہو کر وہ کارہائے نمایاں انجام دیتا تھا۔ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثاروں میں جہاد کا جذبہ اسی تعلیم کا مہزون منت تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ فرد کی تربیت کا مرکزی نقطہ اسلامی نظریہ حیات سے واقفیت تھا۔ اسی معنوی قوت سے وہ حیر العقول کارنامے انجام دیتا تھا۔ آیت کریمہ: فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتُ اِذْ رَمَيْتُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی (۸: ۱۷) اسی قوت کی طرف اشارہ ہے۔ معلوم ہوا کہ جب کسی قوم کو اس کے نظریہ حیات کی پوری طرح تعلیم دے دی جاتی ہے اور اس قوم کا ہر فرد اپنے نظریہ حیات کی تعلیم پر ایمان کامل پیدا کر لیتا۔ تو ایسے ادارے افواجِ قاہرہ پر غالب آجاتے ہیں ”کم من قوتہ

قليلة غلبت فئة كثيرة (۲: ۲۲۹) اور تعلیم اور علوم و فنون سے عاری اقوام لاتعداد افواج اور اسلحہ سازی کی زبردست فیکٹریوں کے باوجود شکست کھا کر مغلوب ہو جاتی ہیں۔ یہ اس لئے کہ لاتعداد افواج قاہرہ کے دلوں میں کوئی چیز و صفت فکر پیدا کرنے والی نہیں ہوتی۔ تحسبہم جميعا و قلوبہم شتى (۵۸: ۱۱۲) آپ انہیں ایک سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں۔ سب سے پہلی وجہ ماقدم کی روشنی میں خود کو نہ ہر فرد کو تعلیم کے زلیور سے آراستہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ کے نصاب تعلیم سے آراستہ افراد جب بھی میدان کارزار میں پہنچے تو تعداد کی قلت فنون و اسلحہ حرب میں مد مقابل سے کم ہونے کے باوجود صرف ایمان و علم معنوی کی طاقت سے انہوں نے وہ کارنامہ انجام دیا جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اسلام میں دفاع کے لئے اسلحہ سازی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن قرآنی نقطہ نظر سے یہ معنوی قوت کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ”رابطہ اٹیل“ کو ”من قوۃ“ کے بعد رکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس صریح حکم کے بعد کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے خلاف پوری قوت تیار رکھیں اور یہ کہ اصل تیاری اسلامی نظریہ حیات کا فروغ اس کا ابلاغ مامم ہے۔ اگر مسلمان قوم اپنے افراد کو جاہل رکھتی اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا کوئی انتظام اور ان کی نشوونما اور تربیت کا اہتمام نہیں کرتی اور ایسی تعلیم کو رواج نہیں دیتی جو روح کو بالیدگی بخٹھے، باطن کے اسرار کھولے اور قرآن کے حقائق کو عام کر دے تو ایسی قوم کے سربراہ اللہ کی نظر میں مجرم ہیں جنہیں نہ قوم معاف کرے گی نہ اللہ تعالیٰ۔ قوم کو دشمن کے مقابلے میں تیار کرنے کی جو ترتیب اللہ رب العزت نے بیان کی ہے اس کو الٹا اور مادی قوت کو معنوی قوت پر ترجیح دینا اسلام سے کفر کی طرف رجوع کرنے کے مترادف ہے۔ جو نظام مسلمانوں کو اس حالت میں رکھے کہ خود مسلمان اپنی جہالت اور عدم تربیت کی وجہ سے دشمنوں سے خوف کھائیں وہ نظام دشمنوں کا نمائندہ اور دوست کے لبادہ میں دشمن کا کام کر رہا ہے ایسے دوست نہا دشمنوں کو کبھی کر دار تک پہنچانا مسلمانوں کا فرض ہے۔

نسل کشی کے دو طریقے  
قتل بالسیف و قتل بالجماعت  
تعلیم قوم کی حیات ہے اور جہالت اس کی موت ہے، جو حکومت  
یا معاشرۃ تعلیم سے اپنی رعایا یا افراد کو تعلیم سے دور

رکھے وہ دراصل قتل کا ارتکاب کرتا ہے۔ قتل دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک باقاعدہ کسی آلہ سے کسی شخص کا گلا کاٹنا اور دوسرے ایسے اسباب پیدا کرنا جو کسی فرد کے قتل و موت کا باعث بن جائیں، کسی شخص کا بازو کاٹ کر تن سے جدا کرنا یا اسے قوتِ نمو اور جوہرِ حیات سے ماری کر کے بے کار کر دینا، معنوی اعتبار سے دونوں ایک ہی طرح کے جرم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں تمام تعمیری صلاحیتیں پیدا کی ہیں، لیکن ان کی نشوونما اور تربیت، معاشرے اور حکومت کا فرض ہے۔ اگر کوئی معاشرہ اور نظام 'انسانیت کے جوہر کی تربیت نہیں کرتا' اور انہیں اسی ابتدائی حالت میں چھوڑے رکھتا ہے تو مقابلہ نامہ ہرگز کا ارتکاب کرتا ہے اور انسان کو جو احمق تویم بنا پیلا ہوا ہے اسفل السافلین کی طرف گرانے لگتا ہے۔

» علم کا نور« اور »علم کی روشنی« اب تک بطور استعارہ استعمال ہوتے رہے ہیں لیکن دورِ جدید میں یہ باتیں استعارہ نہیں حقیقت بن چکی ہیں۔ اس لئے دورِ حاضر میں کسی قوم کو جاہل رکھنا پوری قوم کو تاریکی میں بند رکھنا اور ان کے اعضاء و جوارح تمام صلاحیتوں کو ضائع کر دینا ہے۔ ان کی آنکھوں کے نور اور کانوں کی سماعت بڑا ڈکڑا دانا ہے۔ ان کی فکر و عقل و بصیرت اور دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کو جن جہنم ضائع کرنے کی باقاعدہ منصوبہ بندی ہے۔

یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ قوم کی جہالت کی ذمے داری خود قوم پر ڈال دی جائے اور اقتصادی و معاشی نظام کے ذمہ دار اس کی ذمے داری سے کنارہ کش رہیں۔ یہ انسانیت کے ساتھ کھلم کھلا مذاق ہے۔ انسانیت کے خلاف ظلم کی قبیح ترین صورت ہے۔ کسی ماں کا یہ عذر تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے بچے کا گلا نہیں دبا یا بلکہ بچہ خود بخود اس لئے مر گیا کہ اسے کھانے کو کچھ نہیں دیا گیا۔ اور بیماری میں اس کا علاج نہیں ہو سکا اور موسم کی سختیوں سے اسے بچایا نہیں گیا۔ جس طرح ایک ماں اپنی جملہ ذمہ داریوں سے عہدہ برانہ ہو تو باوجود گلانہ گھونٹنے کے وہ قتل کی جرم ہے۔ اسی طرح حکومت یا معاشرہ پوری قوم کی جہالت اور اپاہج پن کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب کسی جوہر کی صحیح تربیت کر کے اسے اس کام پر نہ لگایا جائے جس کے لئے خالق نے اسے پیدا کیا تھا تو یقیناً اس جوہر میں تعمیر کی بجائے تخریب پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان جو بنیادی طور پر تعمیری صلاحیتیں لے کر دنیا میں آتا ہے اسے تخریب پر ڈالنے کی ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ قوم کے ساتھ منصفیانہ رویہ اختیار کرنے سے کوئی نظام یہ لہکر بری الذمہ نہیں ہو سکتا کہ اس نے تو قوم

کو جو آئم پیشہ نہیں بنایا جبکہ اس نے اسے جاہل اور غیر تربیت یافتہ رکھا جس پر آئم کا عادی بنایا ہے۔ حضرت عمرؓ نے چور غلاموں کے ہاتھ کاٹنے کی بجائے نادہندہ آقلے سے کہا تھا کہ اگر آئندہ انہوں نے چوری کی تو ان کی بجائے تمہارا ہاتھ کاٹو گا۔

فاسمجھ انسان حیوان سے بدتر ہوتا ہے ...  
قرآن حکیم علم و فضل اور عقل و فکر سے عاری افراد و اقوام کو حیوانوں اور چوپایوں سے بھی بدتر قرار دیتا ہے اور اس کے نزدیک جو لوگ معنوی سگاو

بصارت سے محروم ہیں اور جو سننے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں وہ ”شر الدواب“ بدترین آئم کے حیوان ہیں۔ ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون (۲۲: ۸) اللہ تعالیٰ کے نزدیک زمین پر چلنے والے جانوروں میں سب سے بدتر حیوان وہ انسان ہیں، جو بہرے اور اندھے ہیں اور جنہیں عقل و فکر سے کام لینا نہیں آتا۔ عقل و فکر سے عاری انسان، حیوان سے بھی نچلی سطح پر اس لئے گر جاتا ہے کہ انسان کے پاس پیدا کنی طور پر عقل و فکر کا جوہر موجود ہوتا ہے، لیکن جب عقل و فکر کے جوہر کو تعلیم و تربیت کے ذریعے جلا نہیں پہنچتی تو وہ وہی ذہانت و ذلیل حرکات کی طرف مڑ جاتی ہے۔ اور اب اخلاقی پستی اور تخریبی کاروائیوں میں، جب ایسے انسان کا مقابلہ حیوانوں کے ساتھ ہوتا ہے تو حیوان ایسے انسان سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ انسان کو ”شر الدواب“ کی سطح پر گرانے والا دراصل وہ نظام حکومت یا معاشرہ ہوتا ہے۔ جس پر بحیثیت مجموعی انسانوں کی عقل و فکر کو تربیت دے کر انہیں احسن تقویم پر قائم رکھنے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ حکیم جہالت کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ لوگ جنہیں علم و فن کی سہولتیں میسر نہ ہوں کہ باوجود علم سے محروم رکھا جاتا ہے، آنکھیں ہونے کے باوجود ان کی بصارت کی تربیت نہیں کی جاتی اور کان پونج کے باوجود ان کی سماعت کو غیر تربیت یافتہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید انہیں حیوانوں سے زیادہ سنگین قرار دیتا ہے۔ ان اکثرہم یسمعون او یعقلون طعم الاکانام بل انہم علیٰ غلظ علیٰ بیضیلا (۲۵: ۱۷) کیا آپ کا خیال ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں، وہ تو بھلی چوہا لگتے ہیں، نہیں ہیں وہ انسان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ دوسری آیت میں شر الدواب، کو کافر و کاذب اور بتلیا کہتے ہیں کہ جہالت اور علم و فضل سے دوری، اسے ایمان میسی نعمت تک نہیں پہنچے دیتی، ان شر الدواب جنہم نفعنا الذین لا یعقلون طعم الاکانام (۵۵: ۸) اللہ کے نزدیک

بدترین حیوانوں میں سے وہ انسان ہیں جن کی حالت انہیں صحیح تعلیمات اسلامی تک پہنچنے نہیں دیتی اور وہ کفر کی تاریکی میں پڑے رہتے ہیں، اس لئے وہ ایمان لانے سے قاصر رہتے ہیں۔ ایک موقع پر فرمایا: **كَلَّمَ اللَّهُ نَارًا** یعنی اللہ نے عبادۃ العلم کو ۱ (۲۸: ۳۵) اس کی رو سے خوفِ خدا اور اصل انسانیت صرف انہیں لوگوں کو میسر ہے جو علم و فضل والے ہوں۔ قرآن حکیم نے ایسے ہی مجرمین کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ **لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا** (۱۷۸: ۷) ان کے سینوں میں دل تو ہیں، لیکن انہیں چونکہ سوچ، بچار اور افہام و تفہیم کی صلاحیت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ ان سے سمجھ کا کام نہیں لے سکتے۔ **أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا** او اذانِ یسمعون بها۔ **فَأَنهَآ لَا تَعْبَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْبَى الْقُلُوبَ الَّتِیْ فِي الصُّدُورِ** (۲۶: ۲۲) کیا ان لوگوں نے زمین پر چل کر نہیں دیکھا، اگر ان کے دل چھوٹے تو وہ ان سے عقل و فکر کا کام لیتے اور اگر ان کے کان ہوتے تو وہ ان سے سننے کا کام لیتے لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ ان کی آنکھیں تو اندھی نہیں دراصل وہ تو دل کے اندھے ہیں، اسی لئے ان کے دل جو سینوں میں دھڑک رہے ہیں وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ **أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعَمَّى أَبْصَارَهُمْ** (۲۳: ۴۷) یہی لوگ ملعون ہیں جنہیں جسانی کانوں کے باوجود معنوی سماعت سے محروم کر دیا گیا ہے اور جن کی ظاہری آنکھیں ہونے کے باوجود ان سے معنوی اور حقیقی بصارت چھین لی گئی ہے۔

اس دور میں جب کہ غیر مسلم اقوام صحیح معنوں میں سیاروں پر کندیں ڈال رہی ہیں۔ اور چاند اور دوسرے سیاروں کو مسخر کرنے میں زبردست کامیابیاں حاصل کر چکی ہیں۔ مسلم دنیا تاریکی و جہالت میں بھٹک رہی ہے۔ مغرب کی ترقی کا راز صرف اس میں ہے کہ اس نے انسانی اعضاء و اجزاء کی پورے طرح نشوونما کی، ان کی اچھی طرح تربیت کی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں فضا میں معلق ستاروں کی ہر چیز زمین پر بیٹھے نظر آ رہی ہے، انہوں نے معاشرتی، سائنسی اور تکنیکی علوم میں اتنی دسترس حاصل کر لی ہے کہ وہ زمین پر بیٹھے جامد پر بات کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی قوم کے ہر فرد کو زورِ تعلیم سے آراستہ کیا، نتیجتاً ان میں اعلیٰ سے اعلیٰ دماغ پیدا ہونے لگے۔ انہوں نے تعلیم کو عام کیا تو ان کی مجموعی بصارت میں زبردست اضافہ ہو گیا، باطنی صلاحیتوں کی تربیت کا اثر یہ ہوا کہ ان کی مجموعی بصیرت میں لامتناہی ترقی ہوئی اور بصارت و بصیرت کے اس مجموعے میں گراہی ترقی کی کہ وہ قوم جسے کفار کو ناص کرنے کا حکم دیا گیا تھا خود ڈری بھی ہوئی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے دشمنوں سے حیات و امن کی

بھیک مانگتی پھر ہی ہے غیر مسلم اقوام نے اپنے افراد کی اکثریت کو تعلیماتہ کرنے جو مقام حاصل کیا وہ اس بات پر گواہ ہے کہ انسان کے ظاہری و باطنی اعضاء و جوارح کی تربیت و نشوونما سے اس قابل بنا سکتی ہے کہ وہ اپنی چشم بصیرت سے چاند اور منج جیسے بڑے بڑے سیاروں کی ہر چیز کا زمین پر بیٹھے مشاہدہ کرے۔ ان کی تغیر پر شب و روز مصروف ہو جائے۔ لیکن اسی دنیا میں مسلم اقوام اب تک بصارت و بصیرت سے محروم پڑی ہیں۔ وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھی، کان رکھتے ہوئے بھی بہری اور دل و دماغ رکھتے ہوئے بھی عقل و فکر سے عاری ہیں۔

حضور نے مشرکین کو معلم کا مقام عطا کیا بطور خاص مجرم ہیں۔ مسلمان قوم کو تعلیم کی طرف توجہ دینے کی اہمیت اس طرح واضح کی تھی کہ اسے خالق و مالک کی معرفت پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ سب سے پہلی وحی علم و عرفان کے حصول سے شروع ہوتی ہے اور بتدریج اللہ رب العزت کی معرفت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ قرآن پاک کی اس سب سے پہلی وحی کے نزول سے لے کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری سانس تک مسلسل تین سو ۲۳ برس دنیا کی اہل ترین عرب قوم کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کے بیشمار طریقے اپنائے گئے، اور حکومت کی طرف سے ایسے ایسے ذرائع عمل میں لائے گئے کہ ان ذرائع کی مثال آج بیسویں صدی کے ربعِ آخر میں بھی کوئی قوم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جنگِ بدر میں جو مشرکین بطور جنگی قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ ان میں سے وہ لوگ جو چڑھے لکھے تھے اور علم کی روشنی پھیلانے کی اہلیت رکھتے تھے، باوجودیکہ وہ اللہ، رسول اور مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اور اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لئے مدینہ پر چڑھ آئے تھے، حضور اکرم صلعم نے ان جنگی قیدیوں کے ساتھ اس دستور پر سلوک کرنے سے انکار کر دیا، جس پر قبل از اسلام، بعد از اسلام اور آج تک مختلف اقوام عمل پیرا رہی ہیں۔ آپ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ علم جہاں بھی ہو روشنی ہے اس سے آنکھوں میں بصارت پیدا ہوتی ہے۔ ذہن و دماغ میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے عالم کے حامل خواہ مشرکین ہی کیوں نہ ہوں، خواہ اللہ اور رسول کے جانی دشمن ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کی علمی صلاحیت سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

حالیہ علم کو مشرکین ہونے کے باوجود معلم کے محترم مقام پر فائز کیا گیا اور علم سے محروم کے لئے خواہ وہ مومنین اور ان کی اولاد ہی کیوں نہ تھی، مشرکین کی شاگردی اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہ

سمجھی۔ رسول اکرم صلعم کی یہ دہخندہ مثال آپ کی ان لائحہ و دامتہ میں سے ایک ہے۔ جو آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کی خاطر قائم فرمائیں۔ قرآن و تفسیر، حدیث لغت، ادب، تاریخ اور دوسرے فنون کی کتب کا مطالعہ یہ بات واضح کر دے گا کہ رسول اکرم صلعم کے نزدیک علم کے حصول کی کتنی اہمیت تھی۔ اور آپ نے کس طرح صحابہ کرام کو غیر اقوام کی زبانیں اور دیگر علوم و فنون حاصل کرنے کے لئے ترغیب دلائی اور اس کے لئے عملی اقدام فرمائے۔

تعلیم بنیادی ضروریات | اب تعلیم زندگی کی بنیادی ضروریات میں داخل ہو چکی ہے۔ زراعت زندگی میں سے ایک ہے | آج سے کچھ عرصہ قبل روایتی طرز پر کی جاتی تھی اور اس کے لئے کسی سند

یا ڈگری کی ضرورت نہ تھی۔ اس وقت اس کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی۔ سائنسی اور ٹیکنیکی ایجادات نے زراعت میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے کسان کو بھی تعلیم حاصل کئے بغیر اس انقلاب کا ساتھ دینا مشکل ہے۔ دوسرا بڑا عامل یہ ہے کہ سائنسی اور ٹیکنیکی علوم نے زراعت کی وہ اجارہ داری ختم کر دی ہے جو آج سے کچھ عرصہ قبل اسے سب سے بڑے روزگار کے طور پر حاصل تھی۔ جدید صنعتی انقلاب نے زراعت کی اس حیثیت کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ اور اب صنعتی روزگار کی حیثیت سے اگر زراعت کے برابر نہیں تو کم از کم زراعت کے بعد اسی کا مقام ہے۔ روزگار کے آنے سے بڑے ذریعے کے لئے تعلیم ناگزیر ہو گئی ہے۔ جس طرح آج کا کسان تعلیم کے حصول کے بغیر زراعت میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا اسی طرح آج کا مزدور بھی سائنسی اور ٹیکنیکی علوم کے حصول کے بغیر مشینی و صنعتی میدان میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ زراعت و صنعت وہ بنیادی ادارے ہیں جو روز اول سے انسانیت کو روزگار مہیا کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن دورِ جدید نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ آج کی ایجادات کے معمولات میں سے معلوم ہونے لگتی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے چاند کا سفر معجزات میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن جب ۱۹۶۹ء میں وہی کارنامہ انجام دیا جا رہا تھا تو دنیا بھر کے لوگ اس کی ایک ایک لمحے کی خبریں سن کر حیران ہو رہے تھے۔ بعد میں اسی سفر پر جب خلا نورد حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچے تو ایسا معلوم ہوا تھا جیسے لاہور سے پنڈی جاتے ہوئے گاڑی میں کوئی معمولی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔ علوم و فنون میں ترقی کی یہ برق رفتاری اس بات کی مقتضی ہے کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں علوم و فنون کے اس کثرت سے مراکز قائم ہوں کہ ہر انسان لمحہ بہ لمحہ ہونے والی ایجادات و



ترقیات سے پوری طرح واقف رہے اور پھر اپنے علم و تجربہ کی بنا پر ان میں اضافہ کرتا چلا جائے لیکن شومی قسمت دیکھیے کہ جن قوم کی تعلیم و تدریس کا آغاز ”اقدار“ کی وحی الہی نے کیا تھا۔ دور جدید کے معاشی و طبیعاتی علوم کے مقابلے میں بالکل اپاہج ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کا حامل و مبلغ خود جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں پٹلا ہوا اپنے آپ کو سب سے بڑا معلم خیال کرتا ہے۔ خود اعلان بیماریوں میں گرفتار ہے۔ لیکن پوری انسانیت کو بیمار قرار دے کر ان کا معالج بننے کا دعویدار ہے۔

جہالت کا ذمے دار موجودہ معاشی نظام

اس تباہ کن صورت حال کی سب سے بڑی ذمے داری مسلمانوں کے موجودہ اقتصادی و معاشی نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس

نظام میں دنیا جہان کے نظاموں کی برائیاں بدرجہ اتم موجود ہیں اور روئے زمین کے نظاموں کی کسی خوبی کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس نظام میں نہ قرونِ وسطیٰ کے کسی نظام کی خوبی موجود ہے نہ دورِ حاضر کے نظاموں میں سے سرمایہ داری، اشتراکیت اور کمیونزم کی خوبیوں میں سے کوئی اچھا عنصر شامل ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں جہالت قائم رکھنے کی سب سے بڑی ذمے داری موجودہ اقتصادی نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس نظام کا منشا نے اولین یہ ہے کہ مسلمان جاہل رہیں، جاہل رکھنے والوں کو یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں کہ وہ بیسویں صدی کے ربعِ آخر میں وہ کردار انجام دے سکتے ہیں جو زمانہ قبل از تاریخ کے مطلق العنان فرعون انجام دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ صورت اس حال میں ممکن ہے جب لوگ جاہل رہیں مسلمانوں کا سوا و اعظم جاہل رہ گیا تو انہیں ان کے اپنے دین اور ان کے اپنے مذہب کے نام پر غیر مسلم بنایا جاسکے گا۔ مسلمان کا طرہ امتیاز دنیا میں عدل قائم کرنا اور ظلم کے آگے سینہ تان کر کھڑے ہو جانا ہے۔ لیکن یہ جذبہ اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ اسے اپنے دین اور اپنے مذہب کی صحیح اور سچی تعلیمات کا علم ہو، وہ اللہ رب العزت کی ہدایات سے متعارف ہو اور وہ نبی اکرم مسلم کی سنت سے پوری طرح آگاہ ہو، لیکن موجودہ معاشی نظام کے ذمے داروں کے لئے یہ صورت حال بڑی ہی تباہ کن ثابت ہوگی۔ عامۃ المسلمین کو تعلیم یافتہ بنانے کا دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہو گا کہ ظالم خود اپنی موت کے وثیقے پر دستخط کرے، وہ خود مسلمان کو اس قابل بنائے کہ وہ ظلم و جور کو نیست و نابود کر دے، بے انصافی اور استحصال کا قلع قمع کر دے، اور ظلم بے انصافی، استحصال کا خاتمہ خود۔

اس نظام کے ذمہ داروں کا خاتمہ ہے، یہی وجہ ہے کہ موجودہ معاشی نظام کے ذمے دار مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ دورِ جدید میں جب کہ علوم و فنون کا سیلاب آگیا ہے وہ مسلمانوں کے گرد جہالت کا وسیع و مستحکم حصار بنا دیں تاکہ علم کسی طرح ان تک نہ پہنچ سکے۔ اس نظام کے ذمہ دار افراد کی ذہانت کی داد دیجئے کہ انہوں نے جن جن کران ذرائع سے ان پر گراموں کو خارج کر دیا ہے جن سے جاہلوں کو علم ملے اور بے خبروں کو معرفت حاصل ہو۔

جاہلوں کی موثر ترین ذریعہ تعلیم، ٹیلیویشن سے محرومی جو ایجاد کبھی عوام کی بھلائی کے کام آسکتی ہے ہمارے اربابِ حل عقد انتہائی ذہانت اور چابکدستی سے اس پر اس طرح اجارہ داری قائم کرتے ہیں کہ عامۃ المسلمین اس سے کسی طرح بھی مستفید نہ ہو سکیں۔ تعلیم کے لئے دورِ حاضر کی سب سے عمدہ و مفید ایجاد ٹیلیویشن ہے ہمارے ملک میں اسے متعارف کروانے وقت یہی دلیل دی گئی تھی کہ یہ تعلیم و تدریس کا سب سے اچھا عمدہ اور موثر ذریعہ ہے۔ لیکن دیہات جہالت تھی وہاں سے آخری پیسہ تک آبیانے اور دوسرے ٹیکسوں کے نام پر وصول کر کے ملک کی تقریباً نوے فیصد آبادی کو موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا کر دیا، پھر دیہات میں پھیلے ہوئے ان کروڑوں جاہل غلاموں کو زندگی کے اس موڑ پر لاکھڑا کیا کہ وہ بجائے حصول تعلیم کے زندگی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ ٹیلیویشن کی اگر کوئی تعلیمی افادیت ہے تو اس کی سب سے بڑی ضرورت اور اس کا سب سے بڑا تقاضا دیہات ہیں۔ اس لئے ٹیلیویشن کے استعمال پر دیہاتوں کو فوقیت دی جائے اس طرح کہ ٹیلیویشن کے دو ایک سیٹ ایک متوسط گاؤں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہیا کے جائیں۔ اور ان پڑھ دیہاتیوں کو ٹیلیویشن کے ذریعے دورِ جدید کی مفید معلومات ایجادات اور ان کے استعمال سے باآسانی روشناس کرایا جائے۔

واقعی اگر ٹیلیویشن ایک عیاشی نہیں بلکہ ضرورت ہے تو اس سے ناخواندہ دیہاتیوں کو کیوں محروم رکھا گیا ہے

جہالت کا بنیادی سبب موجودہ اقتصادی و معاشی نظام کا تقاضا یہ ہے کہ صرف شہروں میں دیہات سے بے اعتنائی بننے والی اقلیت تعلیم حاصل کر سکے، دنیا کے تمام علوم کا تجربہ صرف شہروں میں کیا جائے۔ ظلم کی انتہا ہے کہ شہریں تعلیمی طوفان ہو، اور دیہات زمانہ قبل از تاریخ کی طرح جہالت

میں ڈوب رہے۔ شہر میں تعلیم کے لئے میونسپل کمیٹیوں، کارپوریشنوں، کینٹونمنٹوں، انجمنوں اور گورنمنٹ کے تعینمی اداروں کی بھرمار ہے، کیڈٹ کالج، ٹریننگ سنٹر، انجینئرنگ، میڈیکل اور قانون کے مراکز ہیں۔ عام تعلیم کی منصوبہ بندی ہو، یا سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی پلاننگ، طبی و فنی علوم کی بات ہو یا ٹریننگ اور تربیت کے مراکز کی سوچ، پچاڑ ہر اعتبار سے شہر کو اولیت حاصل ہے۔

گویا موجودہ اقتصادی و معاشی نظام کے کارکنان نے ملک کی اقتصادیات اور معاشیات پر اجارہ داری قائم کر کے منصوبہ بندی کرنے والوں کے لئے یہ لازمی قرار دے دیا ہے کہ صرف شہریوں کو تعلیم اور علوم و فنون کی اقسام سے آراستہ کیا جائے۔ اور دیہاتیوں کو روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والے حساب و کتاب کی تربیت کا اہتمام کرنے کو ملکی وسائل کی کمی اور ملک کی عام پسماندگی سے تعبیر کر کے کروڑ پانچ لاکھ کو تصدماً جاہل اور ان پڑھ رکھا جائے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اگر اس محروم و مظلوم اکثریت کو اپنی محروم مظلومی کا احساس ہو گیا تو بیسویں صدی کے رنجِ آخر میں وہ اپنے انتقام کے لئے کیا صورت اختیار کرے اور محمد رسول اللہ کی امت کے سوادِ اعظم کو جاہل اور ان پڑھ رکھنے والے نظام کے ذمے داروں کے خلاف کیا قدم اٹھائے۔

کامیابی و ترقی کا راز | سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس عہد میں مسلمانوں کی ترقی کے لئے لازمی دیہات کو تعلیم دینے میں ہے ہے کہ دیہات کو پوری توجہ سے تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ صحیح پیمانہ پر عام یا فنی و تکنیکی تعلیم کا رخ دیہات کی طرف موڑ دیا جائے تاکہ ”فہیضہ من اللہ“ مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے الہی فرمان کی صحیح تعبیر ہو جائے اور جب تک کوئی حکومت اور کوئی نظامِ ملک کے ہر فرد کو تعلیم یافتہ نہیں بنا لیتا اللہ کا یہ حکم اس سے اپنی تکمیل کا مسلسل تقاضا کرتا رہے گا۔ دیہات کا ذہن تازہ، قوی مضبوط اور صلاحیتیں لامحدود ہیں۔ اس میں کام کی لگن محنت و مشقت کی عادت، تعمیر و ترقی کی طرف رغبت اور راست اقدام کی تڑپ موجود ہے۔ اس کی صلاحیتیں جدید افکار و خیالات کی جلا چاہتی ہیں۔ اس کا دماغ وسعت نظر کا متلاشی ہے۔ اس کی ظاہری و باطنی قوتیں اجاگر ہونا چاہتی ہیں۔ ایک ملک گیر تعلیمی پروگرام کے تحت دیہات کو سدھارنے اور ترقی دینے کا تہیہ کر لیا جائے تو اس کی یہی صلاحیت ملکی تعمیر کے کام آسکتی ہیں۔ اس وقت نہ صرف مسلمان ممالک بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ کی تعمیر و ترقی کا راز دیہات کی ترقی و تعلیم میں پوشیدہ ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے جن ممالک نے

اس راز کو پالیا ہے، انہوں نے یورپ و امریکہ کو چند سالوں میں جا لیا ہے

مقابلے کے امتحانات اور دیہات

کہا جاتا ہے کہ انجینئر، ڈاکٹر، پروفیسر، فوج اور رسول کی اعلیٰ ملازمتوں کے لئے کھلے مقابلے کے امتحانات ہوتے ہیں اور یہ مقابلے کے امتحان جس طرح شہریوں کے لئے کھلے ہیں اسی طرح دیہاتیوں کے لئے بھی ہیں۔ ہر وہ شخص جو ایک خاص حد تک تعلیمی لیاقت رکھتا ہو اسے ایسے امتحانات میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے، اور اس میں دیہاتی یا شہری کی کوئی تفریق نہیں۔ یہ بات بظاہر جتنی خوبصورت اور عدل و انصاف پر مبنی نظر آتی ہے۔ باطن اتنی ہی مکروہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایسے امتحانات کے لئے ایک خاص غیر ملکی زبان لازمی ہے جس میں دسترس حاصل کرنا، ایک طبقے کے لئے مخصوص ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جو خاص تعلیمی لیاقت ایسے امتحانات کے لئے ضروری ہے اس کے لئے شہری اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے اس مقصد کے لئے قائم ہونے والے انگلش میڈیم اسکولوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی ضرورت پوری کر لیتے ہیں۔ کسی دیہاتی میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ اپنے بچے کو ایسے اداروں میں تعلیم دلوا سکے۔ ظاہر ہے کہ جو بچہ کے جی سے لے کر بی۔ اے تک اس امتحان کے لئے موزوں ماحول میں تربیت پاتا ہے اس کے مقابلہ میں سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی اور بنگالی میں نا تجرب کار اساتذہ کی زیر تربیت ناسازگار حالات میں ابتدائی تعلیم پلنے والے بچے کیونکر سبقت لے جاسکتے ہیں۔ ضروری ہے کہ دیہات اور شہر کے بچوں کو یکساں سہولتیں میسر ہوں۔ ایک جیسا ماحول دستیاب ہو، تعلیم و تربیت کا یکساں معیار ہو، امتیازی زبان ختم کر دی جائے۔ قومی اور ملکی زبانیں مقابلے کے امتحان کی زبانیں قرار پائیں۔

جہالت کے انسداد کا مؤثر طریقہ زکوٰۃ کا نفاذ

موجودہ حالات میں جہالت کے مسئلہ کو ہنگامی صورت حال کے تحت حل کرنے کی کوشش کی جائے اور نظام زکوٰۃ کے تحت اس مسئلہ کو اس نقطہ (دیہات) سے حل کرنا شروع کیا جائے جہاں اس کا گڑھ ہے۔ ہر علاقے کی زکوٰۃ جمع ہو کر اسی علاقے پر خرچ ہو، اور نظام زکوٰۃ کے تحت ملکی معیشت کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ دولت کی تقسیم دیہات و شہر میں مساوی ہو، دیہات کی دولت، دیہات میں رہے، تو کوئی پیشہ ور دیہات میں خدمت کرنے کو عار نہ سمجھے گا۔ دیہاتی اپنی دولت دیہات کی تعمیر و ترقی میں لگائیں گے اور نتیجہً تعلیم و تربیت کا ایک سنہرا اور تابناک دور شروع ہوگا، وہاں کا بچہ بچہ تعلیم حاصل کر لے گا اور آسودگی کے باعث خوشگوار

تعلیمی ماحول پیدا ہو جائے گا۔ اچھے اساتذہ کی خدمات حاصل کی جا سکیں گی۔ زکوٰۃ فنڈ سے تعلیمی اداروں کی عمارتیں تعمیر کی جا سکیں گی۔ بیکاری اور معاشی غلامی کے انسداد کی وجہ سے ہر شخص فارغ البالی ہو کر تعلیم و تربیت پر زیادہ سے زیادہ توجہ دے سکے گا۔ اسے اپنے بچوں کو تعلیم کیلئے دُور بھیجنے کا بھی خطرہ نہ رہے گا۔ اور دیہات کی پوری آبادی ملک کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہو جائے گی۔

جہالت کے انسداد کی بحث ختم کرنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ نصابِ تعلیم کا تذکرہ بھی کر دیا جائے کیونکہ اس کے مطابق تعلیم کے نتائج نکلیں گے۔

قدیم و جدید نصابِ ہائے تعلیم میں ہم آہنگی کی ضرورت

اس وقت ملک میں دو قسم کے نظامِ تعلیم رائج ہیں۔ (۱) جدید نظامِ تعلیم جسے حکومت نے، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نافذ کر رکھا ہے۔ (۲) قدیم مذہبی نظامِ تعلیم جو عربی مدارس میں رائج ہے۔ جدید نظامِ تعلیم کا مقصد ملک میں ایسے افراد پیدا کرنا ہے جو برطانوی سامراج و استعمار کے سچے جانشین کی حیثیت سے اپنے انگریز آقاؤں کی روایات کی سختی سے حفاظت و نگہداشت کر سکیں، ملکی اور اسلامی اقدار کے احیاء اور ان کی مقبولیت کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو سکیں۔ البتہ بالواسطہ اس نظامِ تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ کو ان جدید معاشرتی اور سائنسی علوم سے روشناس کر لے، جنہیں مغرب نے اپنے جدید مسائل حل کرنے کے لئے اپنے تعلیمی اداروں میں رائج کر رکھے ہیں۔ قدیم مذہبی نظامِ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو زمانہ عوسطی کے اس نصابِ تعلیم کو پڑھائیں جو زوالِ بغداد سے پہلے کے مسائل حل کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ عموماً بغداد سے ان حالات کا تقریباً خاتمہ ہو گیا جو اس سے قبل مسلمان ممالک میں تھے۔ اور تاریخی عوامل نے ماضی سے مختلف حالات پیدا کر دیئے تھے۔ بدلے ہوئے حالات کا تقاضا تھا کہ نئے حالات کے پیش نظر نصابِ تعلیم کو نئے سرے سے مرتب کیا جاتا لیکن چونکہ قسمتی سے مسلمانوں کے فکری انحطاط کی وجہ سے ان کا سیاسی زوال وقوع پذیر ہوا تھا، اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مسئلے کی اہمیت کا پورا پورا شعور حاصل کرتے۔ چنانچہ وہ نصابِ تعلیم کو نئے تقاضوں کے مطابق ترتیب دینے میں ناکام رہے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ نصابِ تعلیم میں ایسے مضامین اور علوم کا اضافہ کیا جاتا جو بدلے ہوئے حالات سے مطابقت رکھتے، اور ان مضامین کو خارج کر دیا جاتا جو اپنی معنویت و افادیت ختم کر چکے تھے۔ یہی وہ تاریخی نقطہ ہے جہاں مسلمانوں نے فکری ارتقا میں جو دم پیدا ہو گیا اور بہت لمبے علوم مثلاً یونانی

فلسفہ و منطق وغیرہ جنہیں سلف غیر اسلامی قرار دے چکے تھے، اور بعد میں حالات کے دباؤ کی وجہ سے نصاب میں داخل کئے گئے تھے، اب عین اسلامی علوم قرار پائے اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کے تقدس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان میں تبدیل و اضافہ خود اسلام میں تغیر و اضافہ سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ تاریخی قوتوں نے مسلمانوں کے ذہنی و فکری ارتقاء کو روک دیا اور ان کا نصابِ تعلیم حالات کی مناسبت سے مکمل تعطل کا شکار ہو گیا، لیکن دوسری طرف حالات نت نئے مسائل پیدا کرتے چلے گئے اور مسلمانوں کا نصابِ تعلیم اسی تناسب سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ نت نئے تقاضوں کے مطابق جدت و ندرت پیدا ہونے کے بجائے قدامت اور رجعت بر طبعی چلی گئی۔ اسی دوران مغرب نے ایک نئے طرزِ حیات کی بنیاد رکھی، اور نئی طرزِ زندگی کے نئے حالات و مسائل حل کرنے کے لئے جدید افکار ابھریں۔ مغرب اپنی سیاسی و اقتصادی برتری کے ساتھ اپنے مسائل اور ان کے حل مسلمان ممالک میں لایا، اس طرح مغرب کے سیاسی و اقتصادی تسلط نے اس کے مسائل اور ان کے حل مسلمان ممالک پر تسلط ہو گئے اور مسلمانوں کا اپنا نصابِ تعلیم عملاً معطل ہو کر رہ گیا، مسلمانوں کا قدیم نصابِ تعلیم لپٹ منظر میں چلا گیا اور حکومت کی بجائے پرائیویٹ معاملہ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ ہمارا موجودہ دوہرا نظامِ تعلیم ان حالات کی پیداوار ہے۔

اس وقت یہ دونوں نظامِ تعلیم ہمارے ہاں رائج ہیں اور دونوں عوام کے سرمایہ سے چل رہے ہیں۔ حکومت عوام سے انکم ٹیکس کے نام پر رقوم جمع کرتی ہے اور علماء و زکوٰۃ (مذہبی ٹیکس) کے نام پر۔ عوام دونوں ٹیکس دینے پر مجبور ہیں۔ حکومت کی وصولی کے پیچھے پولیس اور فوج کی طاقت ہے۔ جب کہ علماء کی وصولی کے پیچھے مذہب کی طاقت موجود ہے۔ تعلیم کے نام پر دوہرے ٹیکس کا نظام عوام الناس کے لئے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ اور شاید مستقبل قریب میں ان کے لئے دونوں ٹیکسوں کے ساتھ وفادار رہنا مشکل ہو جائے۔ اگر جلد ہی کوئی ایسا جامع نظامِ تعلیم مرتب نہ کیا گیا تو امت مسلمہ اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس دوہرے ٹیکس سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ خود ہی کوئی طریقہ ایجاد کریں۔ دونوں نظامہائے تعلیم اپنے اغراض و مقاصد کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں نظامہائے تعلیم دو مختلف ذہن پیدا کر رہے ہیں۔ نقطہ نظر کا یہ اختلاف ہمارے ہاں ذہنی، نفسیاتی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور قانونی انتشار و افراق اور انارکی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ ملک

کی ترقی کے لئے یونیورسٹی کے فارغ التحصیل علماء کی طرف سے بنایا ہوا کوئی منصوبہ مدرسہ کے فارغ التحصیل علماء کے لئے لازماً تکلیف دہ ہوتا ہے۔ صوبائی اور قومی اسمبلی میں بننے والے ہر قانون کی مخالفت ”مدرسہ“ کا فرض اولین ہے۔ ”یونیورسٹی“ اور ”مدرسہ“ دو اسٹیم ساز فیکٹریوں کی طرح اپنی اپنی پیداوار میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ اسلحہ کی فراوانی کے باعث نظریاتی جنگ بلا انقطاع جاری ہے۔ دراصل اس تکلیف دہ اور افسوسناک صورت حال کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کوئی مستقل آئین بنانے میں ناکام رہا ہے اور ہمارے ہاں نظریاتی اختلاف کا سبب بھی یہی ہے اور اسی وجہ سے ہم کسی متفقہ نظریہ حیات اپنانے میں ناکام رہے ہیں۔

ان دو متضاد اور خود مختار نظام ہائے تعلیم کی موجودگی میں کسی متحدہ قومی نقطہ نظر کا ظہور پذیر ہونا ناممکن ہے اور ایسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا خود فریبی ہے۔ عالمی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی اور بہت سے ایسے معاشرتی اور اقتصادی قوانین کی ”مدرسہ“ کی طرف سے شدید مذمت ہو چکی ہے۔ اور مستقبل میں کسی بھی یکطرفہ قانون سازی کا یہی حشر ہوگا۔ اس لئے مدارس کی تعداد اور ان کی پیداوار کی مقدار کا سوال نہیں اصل مسئلہ اس روایتی مقام کا ہے جو انہیں معاشرے میں حاصل ہے اور جس کے زور پر وہ جب چاہتے ہیں حالات کو اپنی موافقت میں بدل لیتے ہیں اور زندگی کے کسی بھی شعبہ میں نافذ ہونے والی اصلاحات کے خلاف ہم چلا لیتے ہیں۔

مسئلہ نظریاتی اختلاف و تصادم نے قوم کو اخلاقی طور پر بالکل مفلوج کر دیا ہے۔ منافقت، دھوکہ بازی، اور بددیانتی وغیرہ کا حجاز اسی صورت کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ فریق اپنے مد مقابل کے خلاف جنگ میں قدام و ارتکھا ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر جو حکومت کی ملازمت کی وجہ سے حکومت کی طے کردہ خاندانی منصوبہ بندی پر دن رات عمل کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ مذہبی وابستگی کی بنا پر اس سکیم سے نفرت کرتا ہے۔ کیونکہ ہر جمعہ کے خطیب میں وہ خاندانی منصوبہ بندی کو اللہ کے خلاف بغاوت اور اس کے دین سے غداری ہونے کا وعظ مستعار رہتا ہے۔ اسی طرح بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور دوسرے تجارتی و اقتصادی اداروں کے ملازمین کے دل دوامغ دو حصوں میں منقسم ہیں، ایک طرف وہ روٹے کے لئے مصملازمت اور اس کی ذمے داریاں نبھاتے ہیں، دوسری طرف دل ہی دل میں اپنی ملازمت سے نفرت کرتے رہتے ہیں۔ اس صورت حال سے معاشرہ میں اضطراب و بے چینی کے سوا اور کس چیز کو فروغ حاصل ہونے کا

ان وجوہ کی بنا پر بلا خوف و لومۃ لائم ہمارا خیال ہے کہ دونوں نظامہائے تعلیم کی موجودگی میں یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں کوئی اصلاح، اساتذہ کے عہدے اور ان کی فلاح کے لئے بہتر و عمدہ، تعلیمی پالیسیوں کی ترتیب نو، کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کر سکیں گے، جب تک دونوں نظاموں کے مکمل ادغام کی طرف توجہ نہیں دی جاتی، نظریاتی اتحاد اور قومی نقطہ نظر کا پیدا ہونا محال ہے۔ مدارس کو یونیورسٹی سے الگ رکھ کر دونوں نظاموں کی ”پیداوار“ کے ذہنوں میں ایک غلطی پیدا کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے خائف رہتے ہیں۔ یونیورسٹی کی پیداوار کے ذہن میں یہ بات بٹھادی جاتی ہے کہ ان کی ڈگریاں بالکل بے سود ہیں۔ کیونکہ اصل علم تو دین کا علم ہے جس سے وہ محروم ہیں اور مدرسہ کی پیداوار کے دل میں یہ بات بٹھائی جاتی ہے کہ قدیم زمانے کے علوم پر دسترس حاصل کرنا بالکل بے سود ہے کیونکہ اصل علوم تو وہ ہیں جو مغرب نے پیدا کئے اور جو ہمارے روزمرہ کے حالات و مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

طلبِ علوم کے بارے میں جو آزادی اور تائید دین اسلام میں ہے اس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔ ہم نے اس مضمون کے آغاز میں ثابت کیا ہے کہ اسلام میں علم فی نفسہ مفید ہونے کے ساتھ ساتھ ارکان کا جزو بھی ہے۔ علم کی اسی اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں نے ہر قسم کے علوم کی تحصیل کا اہتمام کیا اور علم جہاں نہیں نظر آیا اسے اپنی گمشدہ متاع سمجھ کر اپنا یا، اس کی سرپرستی کی، اس کی ترقی و ترویج میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ ”الحکمة ضالۃ المؤمن ایما وجدھا التقطھا“ پھر ”خذ ما صنعنا ما کدر“ کے اصول کے تحت مسلمان کسی علم سے ڈرنے یا خوف کھانے کے بجائے نہایت غوصی اور جرأت سے اسے حاصل کرتا، اس کے حسن و قبیح کو ہر پہلو سے پرکھتا۔ اس کے اصول و مبادی کی تہ تک پہنچتا اور پورے تجزیہ و تحلیل کے بعد قرآنی فرقان کی روشنی میں افذ و ترک کے اصول کے تحت اس کے مفید و کارآمد عناصر کو خندہ پیشانی سے اپنا لیتا۔ علم کے ساتھ قرآن کے پیرائے ہوئے عشق اور روحی الہی کی دی ہوئی فکر نے مسلمانوں کو علمی و فکری طور پر اوجِ ثریا تک پہنچا دیا تھا، وہ دنیا کے کسی علم کے سامنے احساس کمتری یا کسر نفسی میں مبتلا نہیں ہوتا تھا، عربوں کو اپنی عربیت اور لسانی فصاحت و بلاغت پر جو غور تھا، قرآن نے اسے پاش پاش کر دیا اور اس کی جگہ اسلامی عربی روایت کی بنیاد رکھی۔ جزیرہ عرب کے باہر اسلام کو دو عظیم تہذیبوں سے واسطہ پڑا، ان میں سے روم کو اپنے قانون پر ناز تھا اور ایران کو اپنی ثقافت و ادب پر فخر تھا، صدر اسلام کے فقہاء نے روم کے قانون کی روایات میں سے وہ اصول جو اسلامی مزاج کے موافق تھے انہیں اس حسن و خوبی سے اپنا لیا کہ وہ



اسلامی فقہ کا حصہ بن گئے۔ ان بنیادی اصولوں کے اخذ کا نتیجہ تھا کہ رومی قانون کی عظمت جاتی رہی اور اس کی جگہ اسلامی قانون کی بالادستی قائم ہو گئی۔ ایران میں جس ادبی روایت کا چرچا تھا — ادباء نے اس کا مطالعہ کیا اور جب ایرانی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو انہوں نے عربوں کے ساتھ مل کر عربی ادب کو چار چاند لگائے، ایرانی ادب پسپا ہوا اور عربی ادب کا تسلط پوری طرح قائم ہو گیا۔ اس کے علاوہ جن علوم کا براہ راست مسلمانوں سے تصادم نہیں ہوا تھا خود مسلمانوں نے ان کا کھوج لگا دیا۔ یونان میں فلسفے کا بڑا چرچا تھا خود مسلمان خلفائے بے شمار یونانی فلسفہ کی کتب کا عربی میں ترجمہ کروایا تاکہ مسلمان حکماء اس دعوت مبارزت میں آگے بڑھیں اور دنیا پر یونانی فلسفے کے تسلط کا زور توڑ دیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلم فلاسفہ نے یونانی فلسفے کے اصول مہادی کا مطالعہ کیا اور اس کے مقابلے میں اسلامی فلسفے کو پیش کر کے یونانی فلسفے پر اپنی بالادستی قائم کر دی۔ ہندو چین میں بھی اگر کوئی چیز قابل اعتنائی تو اس کو مسلمانوں کے صدر مقام میں جو دراصل علوم و فنون کا مرکز ہوتا تھا لایا گیا اور مسلمان علماء حکماء اور فلاسفہ کو ان کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ مسلمانوں نے ان علوم کی گہرائیوں میں جا کر ان کے مفید عناصر کو چین لیا جو عالمگیر سطح پر انسانیت اور اسلام کے لئے کارآمد ہو سکتے تھے۔ ہمارے خیال میں اسلام کو باقی ادیان پر غالب کرنے (یعظہ علی الدین کلہ) کا یہ طریقہ سب سے عمدہ اور سب سے بہتر تھا (ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ) ایک طرف مسلمان مجاہدین نے میدان کارزار میں اسلام کو غالب کیا تو دوسری طرف علماء و حکماء اور فلاسفہ نے علمی و فکری میدان میں یہ کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ آج بھی ہمیں علمی میدان میں وہی طریقہ اپنانا ہے۔ دنیا کے مروج فکری نظریات سے مسلمانوں کو ڈرانے کے بجائے انہیں اس قابل بنانا ہے کہ وہ سرمایہ داری، اشتراکیت اور کمیونزم وغیرہ نظریات کا کھل کر مطالعہ کریں تاکہ ان میں مضر انسانیت عناصر کو پسپا ہونے پر مجبور کر سکیں اور ان کے مفید و کارآمد اجزاء کو اپنے تعلیمی نصاب میں سمو سکیں۔

یہ عام نظریہ کہ جدید تعلیم کے فروغ سے نظام مدرسہ خود اپنی موت مر جائے گا حقیقت پر مبنی نہیں۔ ہمارے سامنے عہد حاضر کی دو مثالیں موجود ہیں۔ ایک یورپ و امریکہ کی اور دوسرے کیونسٹ ممالک کی۔ یورپ نے صدیاں لگانے کے بعد اس مسئلے کا حل یہ سوچا کہ حکومت اور مذہب کو الگ الگ کر دیا کیونسٹ دنیائے سرے سے دین کو ختم کر کے اس مسئلہ کا حل تلاش کیا۔ پاکستان، عصر حاضر کی تیز رفتاری میں،

نہ تو یورپ کی طرح صدیوں انتظار کر سکتا ہے نہ ایک دم مدرسے اور مسجد سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ ہمیں اپنے مخصوص حالات کی بنا پر اپنا مسئلہ آزادانہ اجتہاد سے خود ہی حل کرنا ہے اور اس کا بہترین حل یہ ہے کہ دونوں نظاموں میں مکمل ادغام کر دیا جائے، دورنگی ختم کر کے یک رنگی پیدا کر دی جائے۔ دونوں نظاموں کے ادغام کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دونوں نظاموں کا پنجوڑے کر لے اس طرح ملا دیا جائے کہ وہ یک جان ہو جائیں۔ ہمارے خیال میں یہ نظریہ بالکل بے بنیاد ہے کہ ایسا کرنے سے خواہ مخواہ طلبہ کو نصاب کے بوجھ تلے دبایا جائے گا۔ کیونکہ ادغام کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دونوں نظاموں کی ابتدا، ارتقاء اور پوری تاریخ ایک دوسرے کے ساتھ رکھ دی جائے بلکہ اس سے مراد یہ ہوگی کہ دونوں نظاموں کے منوم و مضامین کی جانچ پڑتال کی جائے، انہیں چھانٹا پھٹکا جائے اور پورے تجزیہ کے بعد ایسے عناصر کو جن چین کر جمع کیا جائے، جو مسائل حاضرہ اور مقتضیات زمانہ سے پوری پوری مطابقت اور ہمارے اقتصادی، معاشی، قانونی اور سیاسی مسائل کے ساتھ وابستگی رکھتے ہوں گے، ماضی اور حال کے علوم کا تاریخ ابتدا، ترقی و ارتقاء چھوڑ کر تصورات، خیالات اور نظریات و فلسفہ اپنایا جائے۔

موجودہ اختلاف و تصادم کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ زندگی کے بعض شعبوں میں تو یہ بڑا متحرک اور جاندار ہے، لیکن بعض دوسرے شعبوں میں نہایت جامدا ور بے جان نحوتریزہ تصادم عموماً معاشرتی علوم میں ہو رہا ہے اور طبعی علوم میں اس کا وجود بہت کم ہے۔ سائنسی علوم نصاب مدرسہ میں داخل نہیں، غالباً اسی لئے مدرسہ کی پیداوار نہ تو ان علوم کے اس ماضی سے پوری طرح آگاہ بنے جس میں مسلمان سائنسدانوں اور فلاسفہ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے، اور نہ ہی اس کے حال سے بخوبی واقف ہے جس میں مغرب نے حیرت ناک ترقی کی ہے۔ مغرب نے تو صدر اسلام اور ازمنہ توسلی کے مسلم سائنسدانوں کے افکار و نظریات پہلے ہی اپنا لئے ہیں اور مغربی سائنسدانوں نے ان افکار و نظریات کو مزید ترقی دیکر اپنے تصورات و افکار میں جگہ دیدی ہے۔ لہذا اب زمانہ قدیم کے سائنسدانوں کی تاریخ پیدائش و وفات اور ان کی فروعی تفصیلات بتانے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔ مدرسہ بھی اس حقیقت سے واقف ہو چکا ہے چنانچہ ہمارے علماء سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں کہ یونانی فلسفہ و حکمت جو کبھی ضرورت کے تحت مسلمانوں نے اپنائے تھے اگر ان کی جگہ آج وہ مغربی علوم و افکار و تجربات لے لیں جو اسلام کیلئے قوت فراہم کریں، تو یہ تبدیلی نہایت خوش آئند ہوگی۔

عملی ادا نام کے دائرہ کو محدود کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت صرف تین ایسے بنیادی موضوعات ہیں، جن کا ادا نام فوری طور پر نہایت ضروری ہے۔ ہم بقیہ علوم و موضوعات کی اہمیت کے منکر نہیں، تاہم اگر ان تین علوم و موضوعات کے بارے میں جو کچھ مواد نظام مدرسہ میں موجود ہے اسے انتہائی صحت اور کامیابی کے ساتھ یونیورسٹی نصاب میں سمولیا جائے تو نظام مدرسہ میں دینیات ہی باقی رہ جائے گی۔ یہ تین مضامین، قانون، معاشیات اور سیاسیات ہیں۔ قیام پاکستان کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا کہ مسٹر "اور مولوی گنگو لڑائی عام طور پر انہی تین میدانوں میں ہوتی رہی ہے۔ عالمی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی، بینکنگ، انشورنس، حاکمیت اعلیٰ کا تصور وغیرہ مسائل انہیں مضامین کے پیدا کردہ ہیں اس لئے ضروری ہے کہ انتہائی حکمت محرم و مہارت اور محنت سے ان مضامین سے متعلق تفصیل اسلامی علوم سے اس خوبی سے جمع کی جائیں کہ کوئی قابل اعتنا جیسٹہر باقی نہ رہ جائے، اور یہ انتخاب یونیورسٹی نصاب میں حسن و خوبی کے ساتھ سمودیا جائے۔

طریق کار یہ ہو کہ قانون، معاشیات اور سیاسیات کو باقی تمام مضامین پر ترجیح دی جائے اور کالج کے بقیہ مضامین میں ان مضامین کو خصوصی اہمیت حاصل ہو۔ ان مضامین کے موجودہ نصاب کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ان میں اسلامی نقطہ نظر کے لئے پوری گنجائش موجود ہو، ان مضامین کی تدریس کے لئے خاص طور پر اہتمام کیا جائے اور ملک کے ذہین اور ہونہار طلبہ کے لئے وظائف وغیرہ کی کافی کشش مہیا کی جائے۔ وہ طلبہ جو قانون، معاشیات اور سیاسیات میں تخصص حاصل کرنا چاہیں، ان کے لئے لازمی ہو کہ وہ کالج کے پہلے سال ہی ان مضامین کو اپنالیں اور پی۔ اے کے بعد ایم۔ اے اور پی۔ ایچ ڈی کر کے ان میں مہارت تامہ حاصل کریں۔ اس طرح ہمارے مستقبل کے قانون دان، ماہرین معاشیات و سیاسیات اپنی نظیر آپ ہوں گے، وہ سب سے زیادہ قابل، اہل اور ثقہ ماہرین ہوں گے اور سب سے زیادہ وہ اہلیت رکھتے ہوں گے کہ اسلام کو دور جدید میں ایک متحرک اور قابل عمل دین کی حیثیت سے پیش کر سکیں۔ مستقبل کے یہ ماہرین اس مقام پر فائز ہوں گے کہ "مدرسہ اور یونیورسٹی" دونوں کے فاضلین ان کی بات پر توجہ دے سکیں اس طرح پاکستان کو وہ مقام بلند حاصل ہوگا کہ نہ صرف مسلم دنیا بلکہ غیر مسلم دنیا بھی، پاکستان سے رہنمائی طلب کرنے کی ضرورت محسوس کرے گی۔